ڈاکٹر خورشید رضوی کا ترجمہ "تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام" : تحقیقی و تنقیدی جائزہ

Dr. Khurshid Rizvi's translation *"Tāreekh-e-'Uloom mein Tahzeeb-e-Islamī Kā Muqām"*: An Analytical Study

Javed Bhatti

Doctoral Candidate Urdu, AIOU, Islamabad/ Assistant Professor of Urdu Govt. Graduate College of Science, Wahdat Road Lahore, Pakistan

Afshan Noreen

Lecturer in Islamic Studies, The Women University Multan, Pakistan

Ehsanullah

Doctoral Candidate Islamic Studies, University of Sargodha, Pakistan/ Director, Islamic Centre of Daejeon, South Korea

Abstract

Dr. Khurshid Rizvi is a well-known and Eminent literary and cultural personality of present Era. He is multi-dimensional and versatile writer of Urdu. His valuable literary work comprises on poetry, research and Editing, criticism, sketch writing, translation and essay writing. He earned world-wide recognition for his great literary works in Urdu and Arabic. His writing style, language and diction is very unique and impressive. He has full command and grip over Urdu, Arabic, Persian and English languages. This article is all about of his creativity, remarkable research work and translation. He translated the famous historical lectures of Dr. Fawad Sezgin under the German title (Geschichte des Arabischen Shrifttums). Dr. Fawad Sezgin (1924–2018) is a renowned contemporary Muslim Scholar, researcher and orientalist. He was originally from Turkey but spent most of his time in Germany. He

has done his research work mostly in German Language. He learned a lot from great orientalists Hellmut Ritter and Carl Brockelmann. He had devoted his life to Islamic-Arabic Science History. Basically in his thirteen lectures delivered in Saudi Arabia, in 1979, he highlighted the remarkable research works of Arab-Muslims in the field of Social and Natural Sciences before the period of Renaissance. He presented true appraisal about the contribution of Muslim Scholars, Scientists and Philosophers. He also pointed out some misunderstandings of Western orientalists who denied and tempered the Muslims contributions towards Historical tradition of knowledge and philosophy.This valuable research work was originally in German Language and later on it has been translated in Arabic language under the name of تاریخ التراث العربی (عربی ورثے کی تاریخ). Dr. Khurshid Rizvi translated these thirteen lectures (محاضرات فی تاریخ العلوم العربیہ والاسلامیہ) from Arabic into Urdu under the title (تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام). It was published by Idara Tahqeeqat-e-Islami, International Islamic University Islamabad in 1994.

Key word: Khurshid Rizvi, Fawad Sezgin, History of Arabic Heritage, Muslim Civilization, Natural Sciences, Western Scholars

تمہید

پاکستان کے موجودہ ادبی منظر نامے میں ڈاکٹر خورشید رضوی کی شخصیت اپنی کثیر الجہات علمی و ادبی خدمات اور امتیازات کے باعث منفرد اور ممتاز مقام کی حامل ہے۔ وہ عہد حاضر کی بلند پایا علمی و تہذیبی شخصیت ہیں۔ ان کی خدمات کا دائرہ شاعری، تحقیق و تدوین، خاکہ نگاری، تنقید نگاری، مضمون نگاری اور ترجمہ نگاری تک پھیلا ہوا ہے۔ اردو غزل اور نظم میں وہ اپنا الگ اور منفرد دلکش اسلوب رکھتے ہیں۔ عربی ادب کے میدان میں ان کا علمی و تحقیقی کام اس قدر وقیع اور اعلیٰ معیارات کا حامل ہے کہ ان کے مرتبے کا محقق اور مدون دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کی علمی و فکری شخصیت کا ایک اہم زاویہ ان کی ترجمہ نگاری کے فن کے ذریعے روشن ہوتا ہے۔ انھوں نے اس فن کے ذریعے قدیم عربی ادب اور روایت کے ساتھ اُردو ادب کے فکری رشتوں کو از سرِ نو دریافت کرنے کی کامیاب سعی ہے۔ اس حوالے سے "عربی ادب قبل از

اسلام" ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ جس میں قدیم عربی ادب کے اعلیٰ فن پارے اُردو میں متعارف کروائے گئے ہیں۔ اس علمی و فکری سلسلے کا دوسرا اہم کام تُرک اسکالر ڈاکر فواد سیز گین(۱۹۲۴ء-۲۰۱۸ء) کے عربی خطبات کا اُردو ترجمہ "تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام" کے عنوان سے ہے۔ یہ علمی و تحقیقی کام ان کے اس زمانے کی یادگار ہے جن دنوں یہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں صدرِ شعبہ ترجمہ تعینات رہے۔ ان کا یہ دور ۱۱۴کتوبر ۱۹۸۵ء سے ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۱ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس قیام کا بہترین ثمر یہ خطبات ہیں جو اُردو ادب کے لیے کسی پیش قدر تحفے سے کم نہیں ہیں۔ یہ ۱۳ خطبات ادارہ تحقیقات اسلامی کے علمی و فکری مجلّہ "فکر و نظر" میں جولائی-ستمبر ۱۹۸۶ء سے لے کر اپریل-جون ۱۹۹۳ء تک ایک ایک کر کے شائع ہوتے رہے۔ ان خطبات کو کتابی شکل میں اسی ادارہ نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا اور اغلاط سے پاک شدہ ایڈیشن ۲۰۰۵ء میں اسی ادارے کے زیرِ اہتمام منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب ۲۲۵ صفحات پر مشتمل ہے جس کا انتساب "استادِ گرامی ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم کے نام" ہے اور یہ شعر ساتھ درج کیا گیا ہے:

اگر سیاہ دلم داغِ لالہ زارِ تو ام
وگر کشادہ جبینم گلِ بہارِ توام

اس کتاب کی اہمیت اور مقصدیت کے بارے میں ڈاکٹر خورشید رضوی لکھتے ہیں:" یہ منصوبہ، ابتدا سے لے کر ۴۳۰ ہجری تک عربی زبان میں مختلف علوم و فنون کے سرمائے کا ایک فاضلانہ جائزہ ہے۔ کتاب کا مقصد قرآن، حدیث، تاریخ، فقہ، عقائد، تصوف، شاعری، لغت، نحو، بلاغت، طب، بیطرہ، علوم الحیوان، کیمیا، نباتیات، زراعت، ریاضیات، فلکیات، احکام النجوم، آثار علویہ، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاق، سیاسیات، علم الاجتماع، جغرافیہ، طبیعیات، ارضیات اور موسیقی جیسے متنوع میدانوں میں مسلمانوں اور عربوں کے کام کا تعارف کرانا اور ان علوم پر دنیا بھر میں پائے جانے والے عربی مخطوطات کی نشاندہی کرنا ہے۔"[1]

تعارف

ڈاکٹر فواد سیز گین ایک معروف مسلمان محقق ہیں اور ان کی تحقیق کا دائرہ قدیم عربی ادب اور تہذیب کو محیط ہے۔ ان کا اصل وطن تُرکی تھا لیکن ایک طویل عرصے تک جرمنی میں مقیم رہے۔ مشہور جرمن مستشرق ہیلموٹ رٹر (Hellmot Ritter) کے شاگرد تھے اور نامور محقق کارل بروکلمان (م۔۱۹۵۶ء)(Carl Brockelmann) سے بھی پانچ برس تک استفادہ کرتے رہے ہیں۔ وہ بروکلمان کے کیے ہوئے معروف تحقیقی کام "Geschichte der Arabischen Litterature" کی تکمیل کے لیے میدانِ عمل میں آئے۔ ابتدا میں یہ کام بروکلمان کے تتبع ہی میں شروع کیا گیا مگر جلد ہی ڈاکٹر فواد سیز گین کو معلوم ہو گیا کہ صرف بروکلمان کے کام پر مکمل تکیہ کرنا اہم تحقیقی مصادر کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہو گا۔ یہ سوچ کر انھوں نے ان مصادر تک رسائی کی کوشش شروع کی جس پر بروکلمان رسائی حاصل نہ کر سکے تھے۔ اس طرح یہ کام رفتہ رفتہ ان کا اپنا خالص تحقیقی و علمی کام شمار ہونے لگا۔ اس امر کے باوجود بروکلمان کے تحقیقی کام کی اہمیت سے انکار نہیں

کیا جاسکتا۔ یہ دنیا کا پرانا دستور ہے کہ بعض اوقات بعد میں آنے والی نسل، اپنے بڑوں کے نقشِ قدم پر چل کر تہذیبی سفر میں ان سے کہیں آگے بڑھ جاتی ہے۔

یہ خطبات دراصل ڈاکٹر فواد سیزگین کے اس عظیم علمی و فکری منصوبے کی ایک جھلک ہیں جو وہ متعدد جلدوں میں مکمل کر رہے تھے۔ یہ عظیم کام "Geschichte des Arabischen Shirifttums" کے عنوان سے جرمن زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کا فاضلانہ عربی ترجمہ "تاریخ التراث العربی" (عربی ورثے کی تاریخ) کے عنوان سے بھی ہوا ہے اور سعودی عرب کی وزارتِ تعلیم کے زیر اہتمام شائع بھی ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کے بقول اس کے نو حصے ان کی نظر سے گزرے ہیں۔ اب تک کے کام میں قرآن و حدیث، تدوین تاریخ، فقہ، عقائد، تصوّف اور شاعری کے بارے میں لکھا جاچکا ہے۔ عربی کے علاوہ فارسی زبان میں بھی اس کا ترجمہ تہران سے شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر فواد سیزگین کو سعودی عرب کی حکومت نے ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں شاہ فیصل عالمی انعام سے نوازا اور امام محمد بن سعود یونیورسٹی نے انھیں ریاض شہر میں مدعو کیا، جہاں انھوں نے عربی زبان میں سات خطبات دیے۔ ان خطبات کو جامعہ نے ۱۹۷۹ء میں "محاضرات فی تاریخ العلوم" کے نام سے شائع کیا۔ بعد ازاں ۱۹۸۴ء میں چھ خطبات کے اضافے کے ساتھ اسے فرینکفرٹ (جرمنی) سے محاضرات فی تاریخ العلوم العربیہ والا سلامیہ " کے نام سے شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے اسی نسخے کو ترجمہ کے لیے انتخاب کیا ہے اور مکمل ۱۳ خطبات اُردو زبان میں منتقل کیے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر فواد سیزگین کی تحقیق کے حوالے سے ایک اہم بات اسلامی فکر کے بارے میں کہی ہے:" محققین کی ایک بڑی تعداد کے اس خیال سے بھی ڈاکٹر صاحب کو اختلاف ہے کہ عرب ابتدائے کار میں اتنے سادہ تھے کہ نئے علوم کو سمجھ سکنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اور یہ کہ مسلمانوں کے ہاں ارتقائے علمی کا نقطہ آغاز "بیت الحکمت" کا قیام ہے۔ ڈاکٹر سیزگین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مسلمانوں میں نتیجہ خیز فکری و علمی سرگرمی کا آغاز پہلی صدی ہجری ہی میں ہو گیا تھا۔ علم کے بارے میں اہلِ اسلام کا رویّہ فراخ دلانہ تھا۔ انھوں نے بغیر کسی نفسیاتی رکاوٹ کے، اپنے پیش رووں کے علوم کو قبول کیا"۔ [2]

مسلمانوں نے دنیا بھر کے علوم سے استفادہ کرنے اور ایک زندہ تعلق قائم کرنے کی سعی کی۔ محض تقلید کے ذریعے ان کو قبول کرنے کے بجائے ان پر ایک اجتہادی رویہ اپنایا۔ جس سے ان کے اندر نئی قوّتِ اختراع اور تنقیدی بصیرت نے جنم لیا۔ انھوں نے احترام آمیز انداز میں ان علوم کا جائزہ لیا۔ جسے ڈاکٹر سیزگین اخلاقی اسلوب کا نام دیتے ہیں۔ انھوں نے اس حوالے سے البیرونی اور ابن الہیثم کے جو اقوال اپنے خطبات میں نقل کیے ہیں وہ مسلمانوں کے اعلیٰ تنقیدی معیارات کے عکاس ہیں:

> "اس عمل سے مسلم معاشرہ تیسری صدی ہجری کے اواسط میں تازہ کاری کے مرحلے میں داخل ہوا جس کی مثالیں بنو موسیٰ، الماہانی، ابو بکر رازی، الکندی اور ابنِ سنان جیسے لوگوں کے کارناموں کی صورت میں تاریخ علوم کے صفحات پر زندہ و پائندہ ہیں۔ مسلمانوں نے نظریے اور تجربے کے مابین توازن قائم کیا، نئے علوم کی طرح ڈالی اور اصطلاحات سازی میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں"۔ [3]

ان خطبات کے ترجمہ کے حوالے سے ڈاکٹر خورشید رضوی کا کام اس لیے بھی اہم اور قابلِ تحسین ہے کہ ان میں موجود بعض مباحث اور اصطلاحات نے ان خطبات کو کسی حد تک مُغلّق بنا دیا تھا۔ ایسے مقامات کے ترجمہ پر انھوں نے کمال علمیت اور فہم سے کام لیتے ہوئے ابلاغ کی جو صورت پیدا کی ہے، اس سے بڑی حد تک اصل معنی و مفہوم اور مقصد اُردو قارئین کی دسترس میں آ گیا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

ترجمہ کے معنی و مفہوم

ترجمہ عربی زبان کا لفظ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ایک زبان کا کسی دوسری زبان میں بیان کرنا۔ انگریزی میں اسے Translation کہتے ہیں جس کے معنی منتقل کرنا یا پہنچانا ہے۔ کسی بھی تہذیب کا مسلسل ارتقا اور اس کا فعال کردار اس کے زبان و ادب کے متحرّک اور مؤثر ارتقا کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ اگر ادب اور زبان میں ارتقائی عمل رک جائے تو تہذیبی سطح پر ایک ایسا جمود پیدا ہوتا ہے جو آگے چل کر تہذیبی اور ادبی بحران کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ہر ادب اپنی فعالیّت کو برقرار رکھنے کے لیے دنیا کے بڑے ادب پاروں کے ساتھ اپنا تعلق مسلسل قائم رکھتا ہے اور اس میں آنے والے ذہنی و فکری انقلابات کو اپنی تہذیبی اساس کو مد نظر رکھتے ہوئے قبول کرتا ہے۔ دنیا کے ہر ادب کے ساتھ اس زندہ تعلق کی بنیاد ادبی افکار اور تحاریک پر مبنی ہوتی ہے اور دنیا کا ہر ادب ان جدید افکار کے ساتھ ترجمہ کے ذریعے خود کو وابستہ کرتا ہے۔ ترجمہ کے ذریعے ادب نہ صرف نئے فکری مباحث کو قبول کر کے اپنے تنقیدی سانچوں اور معیارات کو جدید عہد کی ضروریات کے مطابق ڈھالتا ہے بلکہ ان تراجم کے ذریعے نئی ادبی اصناف کو بھی قبول کرتا ہے۔ یہ نئی ادبی اصناف موضوعات اور حسیات کی سطح پر مثبت تبدیلی لاتی ہیں اور ادب بندھے ٹکے موضوعات اور افکار سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے لگتا ہے۔ ترجمے کے فن کے حوالے سے نامور نقاد شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں: "کامیاب ترجمہ وہ ہے جو اصل کے مطابق ہو (یا بڑی حد تک اصل کے مطابق ہو) اور خلاقانہ شان رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ دونوں باتوں کا یک جا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن ترجمے میں کامیابی کا تصور بہت وسیع ہے۔ اور اگرچہ کوئی بھی شخص اس کامیابی کی پوری وسعت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اچھے اور خوش نصیب مترجم اس کے بڑے حصے کا احاطہ ضرور کر سکتے ہیں۔"[4]

ترجمے کی مختصر روایت

ترجمے کی تاریخ اور روایت کا مختصر جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آغاز عربوں سے ہوا۔ فلسفہ اور سائنس سے متعلق یونانی اور سریانی زبانوں کی کتابوں کا پہلی صدی ہجری میں ترجمہ کیا گیا اور پھر مسلمانوں نے ہی اس روایت کو مزید پروان چڑھایا۔ پھر عربی زبان سے فارسی، اُردو اور پنجابی زبانوں میں قرآن مجید اور دوسری کتابوں کے تراجم کیے گئے۔ مسلمانوں کی اسپین پر حکومت کے زمانے میں بھی عربی اور لاطینی زبانوں میں تراجم کا کام کیا گیا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں تراجم کا سلسلہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ دورِ جدید میں ترجمے کا کام اب باقاعدہ مشینوں کے ذریعے لیا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں مغلیہ خاندان کے زمانے میں ابتدائی طور پر فارسی تراجم سامنے آتے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں سنسکرت سے ریاضی اور فلسفہ وغیرہ کی کتابوں کے فارسی تراجم کیے گئے۔ سترھویں صدی عیسوی میں بہت بڑی تعداد میں

فارسی، عربی اور سنسکرت سے اُردو زبان میں ترجمے کیے گئے۔ ان تراجم میں شاعری، تصوّف، داستانیں، فلسفے اور ہیئت وغیرہ کی کتب شامل تھیں۔

اُردو ادب نے اپنی تشکیل کے ابتدائی ادوار سے لے کر جدید عہد کی فکری تبدیلیوں تک عالمی ادب سے اخذ و استفادے کی ایک مستحکم روایت قائم کی ہے۔ یہ روایت ہر آنے والے عہد میں مزید مضبوط دکھائی دیتی ہے۔ اُردو نثر میں یہ روایت خاص طور پر بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ہماری نثر کا تقریباً تمام ارتقا ہی انگریزی ادب اور اس کی اصناف کے ذریعے ہوا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی تحریک کو ہم مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک کو بھی ہم فورٹ ولیم کالج کی روایت کی ایک توسیع قرار دے سکتے ہیں کیوں کہ دونوں تحاریک نے ادب کے عالمی معیارات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) سائنٹفک سوسائٹی غازی پور، انجمن پنجاب لاہور، انجمن ترقی اُردو ہند و پاکستان، مجلسِ ترقی ادب لاہور، ترقی اُردو بورڈ کراچی، اُردو سائنس بورڈ لاہور اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کی خدمات تراجم کے حوالے سے قابلِ ذکر ہیں۔

تراجم کے ذریعے عالمی ادب سے اثر قبول کرنے کی یہ روایت اُردو ادب میں مسلسل جاری نظر آتی ہے۔ ترجمے کی افادیت کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو جہاں اس کے ادبی، لسانی اور فکری زاویے ہمارے سامنے آتے ہیں وہاں اس کا ایک اور اہم تہذیبی زاویہ بھی روشن ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جیلانی کامران کی رائے دیکھیے:

> "ترجمے کی ضرورت تہذیبی نشوونما کے لیے لازمی ہے کیوں کہ تہذیبیں ایک عرصے کے بعد اپنے سرچشموں کو خشک کر دیتی ہیں اور اپنے آپ پھر کوئی نئی شے پیدا نہیں کر سکتیں۔ اس طرح وہ ذہنی علیحدگی اور یک طرفہ تہذیبی تعصّب کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس بیماری کو ترجمے کا عمل دور کرتا ہے۔"[5]

تراجم کے ذریعے عالمی ادب کے ساتھ تخلیقی رشتہ استوار کرنے کی یہ روایت فورٹ ولیم کالج سے شروع ہو کر جدید عہد تک پوری طرح فعال دیکھائی دیتی ہے۔ تراجم کے حوالے سے سیرت النبیؐ کے موضوع پر جتنا وسیع سرمایہ اُردو ادب میں موجود ہے دنیا کی کسی دوسری زبان میں موجود نہیں ہے۔ اس امر سے ہم اُردو میں ترجمہ نگاری کے فن کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جدید تنقیدی مباحث، فکشن اور سائنس کے موضوعات پر ہر سال ایک بہت بڑی تعداد میں کتابیں شائع ہو رہی ہیں اور اردو زبان نئے نئے موضوعات اور اسالیب سے آشنائی حاصل کر رہی ہے۔

خطبات کے تراجم کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ

ڈاکٹر فواد سیزگین نے پہلے خطبے میں اپنی کتاب "تاریخ التراث العربی" کی تالیف کے مقاصد اور طریقِ کار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے لاطینیوں کی عرب دشمنی اور اس کے نتیجے میں استشراق کے ظہور اور علوم مشرق کے اعتراف کے مختلف مراحل کو موضوع بنایا ہے۔ اور اس سارے سفر کی روشنی میں آگے بڑھتے ہوئے ان پوشیدہ گوشوں کو سامنے لانے کی کاوشوں کا تذکرہ کیا ہے، جو مستشرقین کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے۔ انھوں نے مستشرقین کے بنیادی کاموں کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا کام کیا ہے جو ان کی علمی دیانت اور وسیع ظرفی کی علامت ہے۔ اس سلسلے میں

انھوں نے ہالینڈ کے مستشرق جیکب گولیس (Jacobus Golius) سے لے کر اپنے استاد ہیلموٹ رٹر تک کے علمی کارناموں کی ستائش کی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی کتاب کی مختلف جلدوں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے جو اُردو ادب کے عمومی قارئین کے لیے بہت کارآمد ہے۔ آغاز سے ۴۳۰ ہجری تک کی تاریخ اور علمی ارتقا کو احاطہ تحریر میں لانا اور وہ بھی صرف دس یا گیارہ جلدوں میں بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان مجلّدات کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی کی رائے قابل دید ہے۔ وہ لکھتے ہیں :"پیشِ نظر خطبات میں ڈاکٹر فواد سیز گین نے پہلی مرتبہ خالص علمی انداز میں مختلف علوم میں مسلمانوں کی خدمات کا نہایت چھان پھٹک کے بعد جائزہ مرتّب کیا ہے اور طب، کیمیا، ریاضیات، فلکیات اور آثار علویہ میں مسلمانوں کی نہایت قابل قدر خدمات کو آئینہ کرنے کے ساتھ ساتھ عربی اور اسلامی علوم میں اَسناد کی اہمیت اور اسلامی ثقافت میں جمود کے اسباب جیسے موضوعات سے بھی اعتنا کیا ہے۔ ان خطبات میں اجمالاً ہی سہی، انھوں نے بعض ایسے حقائق بیان کیے ہیں جنھیں ان کی "اوّلیات" قرار دیا جاسکتا ہے"۔[6]

دوسرے خطبے "تاریخِ علوم میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام" میں بتایا گیا ہے کہ یہ عام تصوّر کہ علوم کا ارتقا خصوصاً ان علاقوں میں ہوا جو بحیرہ روم کے طاس میں واقع ہیں، دو ہی طرح کے سیاسی مرحلوں سے گزرا ہے۔ ایک یونان قدیم کا مرحلہ اور دوسرا مغربی دنیا کا مرحلہ جس کا آغاز تحریکِ احیائے علوم کے ظہور سے ہوتا ہے۔ یہ خیال اب مختلف تحقیقی شواہد سے غلط ثابت ہو چکا ہے۔ ان تحقیقی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یونان کو ڈھائی ہزار سال کی علمی وراثت ملی ہے اور ان سے پہلے علمی میدان میں بہت سے کارنامے انجام دیے گئے۔

ڈاکٹر فواد سیز گین نے اپنی تحقیقی چھان بین سے جو شواہد جمع کیے ہیں وہ ان کے مفروضے کو ثابت کرنے کے لیے کافی معلوم ہوتے ہیں اور یوں اہلِ یونان کی علمی برتری اور اوّلیت کا تصوّر غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ یہاں عربوں کے ان علمی کارناموں کا تذکرہ ہے جن کے ذریعے بطلیموس جیسے حکما کے قیاسات اور فلکی زائچے علمی سطح پر دلائل سے رد کیے جا چکے تھے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ عربوں نے علم کیمیا کو نظری اور عملی بنیادوں پر استوار کیا۔ اس خطبہ میں عربوں کے دیگر اقوام کے علوم اور فکر سے اخذ و استفادہ کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے کہ پہلی تین ہجری صدیوں میں مسلمان اس حوالے سے مجبور تھے۔ اس لیے انھوں نے یونانی، ہندوستانی، ایرانی اور سریانی علوم اور دانش سے فائدہ اٹھایا۔ بہت سے تراجم کیے اور ان پر طالب علمانہ انداز سے نظر ڈالی، کسبِ فیض کیا اور ان زبانوں کے علما کے بارے میں محتاط رائے دی، جس میں احترام کا جذبہ غالب تھا۔

تیسرے خطبے "تاریخِ طب میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام" میں ڈاکٹر فواد سیز گین نے بتایا ہے کہ علمِ طب میں بھی مسلمانوں نے یونانی علوم سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت سے یونانی تصوّرات کو دلائل سے رد بھی کیا اور نظری اور عملی سطح پر بعض بنیادی نوعیت کے کام کیے۔ انھوں نے بہت جلد طب کے نظری اور عملی پہلوؤں کو شناخت کر کے ان دونوں کے درمیان توازن کا ایک عنصر مقرر کر لیا اور پھر اس اصول کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھایا۔ پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں نے دیگر اقوام کے علم طب سے اخذ و استفادہ شروع کیا۔ ان کے اولین ترجمے طب عملی اور دواسازی

سے متعلق تھے۔ دوسری صدی ہجری کے وسط میں انھوں نے بقراط اور جالینوس وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ شروع کیا۔ چوتھی صدی ہجری میں ابو القاسم الزہراوی نے علم طب اور جراحت کو عروج بخشا۔ اس کی شہرہ آفاق کتاب "التصریف" کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ بیزنطہ، اٹلی اور سسلی کے راستے علم طب کی کتابیں یورپ اور لاطینی دنیا میں پہنچنا شروع ہوئیں۔

ڈاکٹر فواد سیز گین بتاتے ہیں کہ عربی کتب طب کو لاطینی دنیا میں پہنچانے کا کام الجزائر کے ایک عرب تاجر کے ذریعے ہوا۔ یہ شخص قسطنطین الافریقی تھا اور ستّر کے قریب طبی کتابوں کو لاطینی زبان میں ترجمہ کرنے کے بعد عیسائی ہو گیا۔ یہ وسیلہ گویا طب جدید کا اہم سرچشمہ تھا جو اہل یورپ کے لیے پھوٹ پڑا۔ اس کام کی تکمیل اٹلی کی ایک خانقاہ میں ہوئی جہاں مسلمانوں کی بہت سی کتابوں جو دراصل عرب اطباء کی تالیف تھیں، اہلِ یونان سے یا خود قسطنطین سے منسوب کر دیا گیا۔

چوتھے خطبے "علمِ کیمیا کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام" میں ڈاکٹر فواد سیز گین نے علمِ کیمیا کے شعبے میں مسلمانوں کی علمی خدمات کو موضوع بنایا ہے۔ یہ علم پہلے بیان کیے گئے موضوعات سے نسبتاً جدید ہے۔ اس خطبہ میں ڈاکٹر صاحب نے طویل بحث کے بعد دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ علم کیمیا میں لاطینی مصنف Geber کی کتابیں دراصل مسلمان محقق و مفکر جابر بن حیان کی کتب کا سرقہ ہیں اور ان کا اصل مصنف جابر بن حیان ہی ہے۔ اس طویل بحث میں انھوں نے مختلف محققین کے اخذ کردہ نتائج پر گرفت کی ہے اور ان کی تحقیق کو باطل قرار دیا ہے۔

عرب اور لاطینی حکما کے درمیان موجود بنیادی فرق ان کے علمی استدلال کا بنیادی نکتہ ہے۔ عربوں نے مختلف علوم میں دوسری اقوام سے اخذ و استفادے میں کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کیا۔ دیانت داری سے ان کو تسلیم کیا جب کہ لاطینی اقوام عربوں کے بارے میں بغض، حسد اور عناد کے جذبات رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اقوام کے ہاں اخذ و استفادے کو تسلیم کرنے کے بجائے سرقہ کا عمل نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے ایک ثبوت انھوں نے یہ دیا کہ جابر بن حیان کے بعد آنے والے معروف عرب کیمیا دان ابو بکر رازی کو تو وہ لوگ تسلیم کرتے ہیں جب کہ جابر بن حیان کو ایک خیالی شخصیت تصور کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فواد سیز گین کے الفاظ دیکھیے:

> "جو کچھ تدابیر و نظریات Geber کی کتابوں میں ملتے ہیں، سب کے سب جابر بن حیان کے ہاں اسی طرح پائے جاتے ہیں۔ اس مسئلے کی توضیح کا بیڑہ اٹھانے والے مؤرّخ علوم پر لازم ہے کہ وہ اسے یورپ میں عربی و اسلامی علوم سے اخذ و اکتساب کے ذیل میں رکھے۔ وہ دیکھے گا کہ لاطینی یا تو عربی کتابوں کے سرقے کے مرتکب ہوتے تھے یا حرف بہ حرف ان کا ترجمہ کرتے تھے یا ناپختگی کے ساتھ ایسا ترجمہ کرتے تھے جس میں تحریف ہوتی تھی، یا انھیں غیر حقیقی مصنفین سے منسوب کر دیتے تھے"۔[7]

پانچواں خطبہ "ریاضیات کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام" بہت اہم ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی بھی ماحول میں کوئی بھی شعبہ علم الگ سے ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا جب تک کہ علم کے دیگر شعبوں اور

میدانوں میں پیش رفت کا عمل ہم آہنگ نہ ہو۔ اس لیے مسلمانوں کے ہاں تاریخِ علوم میں ارتقا اور پیش رفت کا عمل ایک ساتھ آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ ریاضی کے علم میں ہونے والی ترقی اور پیش رفت ثابت کرنے کے لیے یہ بنیادی کسوٹی کام میں لائی جا سکتی ہے۔ انھوں نے اس اصول کو علومِ عقلیہ و نقلیہ سب کے لیے اساس قرار دیا ہے۔ یہ اصول جس طرح ماضی میں کار فرما تھا اسی طرح زمانہ حال میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مختصر سا خطبہ ریاضی کے شعبہ میں مسلمانوں کی اساسی خدمات کا عکس پیش کرنے میں مکمل طور پر پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے۔ ریاضیات کے میدان میں مسلمانوں نے دوسری صدی ہجری میں یونانی اثرات کو قبول کرنا شروع کیا۔ اس کا آغاز کتاب اصول الھندسہ کے ترجمے سے ہوتا ہے۔ تیسری صدی ہجری کے آخر میں مسلمانوں کے ہاں تاریخ ریاضیات میں مہارت اور تازہ کاری کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر فواد سیزگین کے بقول:

> "اگر ہم عرب ریاضی دانوں کے کام کا مجمل تعارف چاہیں تو یہ کہنا مناسب ہو گا کہ اہل یونان نے بہت سے مسائل اور قضیے[Propositions] جو بلا ثبوت پیش کر دیے تھے انھوں نے ان کا ثبوت مہیا کیا۔ نئے مسائل وضع کیے جن کی طرف یونان کی نظر نہیں گئی تھی۔ اسلاف کے ہاں جو کچھ ملتا تھا اس میں بہت سی اصلاحات کیں اور جو کچھ اسلاف سے ورثے میں پایا تھا، اسے ترقی دی۔"[8]

چھٹا خطبہ "فلکیات کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام" کے موضوع پر دیا گیا۔ اس میدان میں مسلمانوں کی خدمات کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا اور اس حقیقت کو منظر عام پر لانے کا کام بھی مستشرقین کے ہاتھوں انجام پایا۔ فاضل محقق نے اس ضمن میں بجا طور پر علمِ فلکیات میں مسلمانوں کے کردار کو اُجاگر کرنے میں مستشرقین کی کاوشوں کو لائق تحسین گردانا ہے۔ دنیائے علوم کئی صدیوں تک مسلمانوں کے اس کردار سے انکار کرتی رہی۔ بالآخر انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مستشرقین نے اسلامی علوم اور تہذیبی ورثے پر تحقیق اور اس حوالے سے مخطوطات کی اشاعت کی مہم شروع کی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے علمی کارناموں سے اہلِ علم و دانش واقف ہوئے۔

فلکیات کی عمومی تاریخ میں مسلمان ماہرین فلکیات کا حصّہ بہت بڑا اور ابداعی نوعیت کا ہے۔ عرب اسلامی فلکیات کا علم دسویں صدی عیسوی میں یورپ منتقل ہوا اور یورپی ممالک میں اس سے فیض یاب ہونے کا سلسلہ سولہویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ ڈاکٹر سیزگین کے بقول:

> "اب تک اس میدان میں محققین کی کاوشوں سے جو کچھ روشن ہو سکا ہے اس نے اس بات میں شک کی گنجائش نہیں چھوڑی کہ فلکیات کی عمومی تاریخ میں مسلمان ماہرین فلکیات کا حصہ بہت بڑا اور ابداعی[Original] نوعیت کا ہے۔"[9]

خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں شمّاسیّہ، بغداد اور دمشق کے نواح میں کوہِ قاسیون پر ایک رصد گاہ کا قیام علمِ فلکیات کے حوالے سے مسلمانوں کی سنجیدہ کاوشوں کا ثبوت ہے۔ تاریخ میں کہیں یہ واضح نہیں کہ اس نوعیت کی رصد گاہوں کا قیام اس سے قبل ثابت ہے یا نہیں۔

ساتواں خطبہ "عربوں کی فلکیات کا یورپ پر اثر" کے عنوان سے ہے۔ جس میں عربوں کے علم فلکیات کے گہرے اثرات کی نشاندہی مدلل ذرائع سے کی گئی ہے۔ اس خطبہ کے آغاز میں یورپ میں تیرھویں صدی عیسوی کے علمی و فکری انقلاب کے بارے میں بڑی اہم بات منظرِ عام پر لائی گئی ہے کہ تیرہویں عیسوی میں قائم ہونے والی یہ یورپی یونیورسٹیاں دراصل طلیطلہ کے راستے مکمل طور پر اسلامی یونیورسٹیوں کی تقلید میں بنائی گئیں۔ مغربی تحریک احیائے علوم کے تمام پہلوؤں پر اسلامی علوم اور ثقافتوں کے عمومی اثرات تین راستوں یعنی ہسپانیہ، اٹلی اور بیزنطہ کے ذریعے عمل میں آئے۔ ڈاکٹر فواد سیز گین کے بقول:

> "جوں جوں انسان یورپ کے اصل مآخذ کی گہری تحقیق کرتا ہے اس کے ہاں یہ تصوّر قوت پکڑتا چلا جاتا ہے کہ وہاں کی نام نہاد تحریک احیاء اس بچے سے از حد مشابہت رکھتی ہے جسے اس کے حقیقی باپ کے بجائے کسی اور کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو"[10]

آٹھویں خطبے "آثار علویہ (Meteorology) کی تاریخ میں مسلمانوں اور عربوں کا مقام" میں ڈاکٹر فواد سیز گین نے بتایا ہے کہ اس میدان میں زیادہ تر کام الکندی، ابن الہیثم اور البیرونی کے ذریعے ہوا اور بد قسمتی سے ان کی بہت سی کتب ضائع ہو گئی ہیں۔ ان کتب کے علمی آثار اور حوالے مخصوص رسائل اور مسلمان فلسفیوں کی مختلف آرا میں موجود ہیں، جو ان کتب میں بالواسطہ طور پر زیر بحث آئے ہیں۔ آثار علویہ سے مراد وہ اشیا یا تغیرات ہیں جن کی نمو دزمین سے اوپر ہوتی ہے۔

اس خطبے میں ڈاکٹر فواد نے آثار علویہ کی تاریخ میں معروف مصنف ابراہیم بن سنان کی اہم ترین عربی کتاب "الابانة عن الطريقة المتعرفة" کے ان مندرجات کا ذکر کیا ہے۔ جن میں ارسطو کے تصوّرات اور نظریات پر تنقید کی گئی ہے اور دلائل کے ساتھ درست نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ ان نتائج کو جدید علومِ علویہ میں مستند مانا گیا ہے۔ اس مصنف کی وفات چوتھی صدی ہجری میں ہوئی۔

نواں خطبہ ایک بہت اہم موضوع کو دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ "یورپ کی تحریکِ احیاء پر عربی و اسلامی علوم کا اثر"۔ اس خطبے کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس موضوع پر بہت سے علماء بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اس تناظر میں ڈاکٹر فواد سیز گین کے نکتہ نظر کو سمجھنا از حد ضروری ہے کیوں کہ اس مرتبے کا محقق اور عالم کسی گھسے پٹے موضوع پر فقط گھسی پٹی باتوں سے اوراق کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

اس حوالے سے ڈاکٹر فواد سیز گین بتاتے ہیں کہ انیسویں صدی کے وسط سے پہلے عربی اور اسلامی علوم کے بارے دنیا میں بالعموم ایک منفی رائے پائی جاتی تھی۔ حالانکہ پورے یورپ کے علماء اپنی اپنی زبانوں میں عربی و اسلامی علوم کو "عربی علوم" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان یورپی علما کی فکر اور کتابوں پر مسلمان علما خصوصاً ابن سینا، ابن رشد، جابر بن حیان، الکندی اور ابن الہیثم کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں معروف جرمن مستشرق جیکب ریسکے اور شہرہ آفاق جرمن ادیب گوئٹے نے علومِ اسلامیہ کی نفی کے خلاف ڈھال کا کام کیا۔ مگر ان کی آواز مجموعی منظر نامے میں کوئی بڑی تبدیلی نہ لا سکی اور تاریخِ علوم کے ماہرین علما کا رجحان اسلامی علوم کی بنیادی اہمیت کی طرف نہ بن سکا۔

ڈاکٹر سیز گین نے اپنے موضوع کے پہلے حصّے کی طرف اسلامی دنیا کے محققین اور علما کی توجہ دلاتے ہوئے بتایا کہ یورپ کی تحریکِ احیائے علوم پر اسلامی فکر کے اثرات کے مطالعہ سے پہلے یہ امر ضروری ہے کہ ہم مستشرقین کے بنے بنائے سانچوں اور فکری نتائج پر انحصار کرنے کی بجائے اپنے علمی ورثے کا خود بغور تحقیقی جائزہ لیں۔ اگر ہم یہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ پر اور دنیا کے بڑے بڑے محققین اور علما پر واضح ہو جائے گا کہ یورپ کی تحریک احیائے علوم پر اسلامی علوم کا اثر اس قدر وسیع اور گہرا ہے کہ اس کا تصوّر کرنا بھی ناممکن ہے۔ ان کے خیال میں یہ رائے محض ایک خیال یا تاثر پر مبنی نہیں بلکہ ان علوم اور ادوار پر تیس برس کے مسلسل مطالعے اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں غیر اقوام کے علوم سے اخذ و استفادہ کرنا شروع کیا اور ان کے علوم و معارف کو بغیر کسی نفسیاتی الجھن اور دینی رکاوٹ کے قبول کیا۔ تیسری صدی ہجری میں مسلمانوں نے اہلِ یونان، اہلِ بابل، اہلِ ہند اور اہلِ ایران کے علمی ورثے کو ترقی دی اور اس میں بہت سی اصلاح کی۔ جو علوم اسلامی تہذیب و تمدن کے زیر اثر پروان چڑھے وہ تیسری صدی ہجری میں دوسری اقوام کی طرف منتقل ہونا شروع ہوئے۔ چنانچہ کیمیا، طب اور احکام النجوم کی بہت سی کتابوں کا عربی سے یونانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ اسلامی علوم اُندلس سے ہو کر مغربی مسیحی دنیا میں داخل ہوئے۔ اسی طرح عربی سے لاطینی زبان میں قدیم ترین تراجم چوتھی صدی ہجری کے نصف ثانی میں کیے گئے۔ لاطینیوں نے اس کا آغاز سرقے سے کیا۔ وہ تصانیف کو اصل لکھنے والوں سے منسوب نہیں کرتے تھے جب کہ اسلامی تمدن میں اصل مصنف کا نام لکھنے کا اصول رائج تھا۔ چھٹی صدی ہجری کے دوران لاطینیوں نے جو کتابیں تالیف کیں وہ عربی کی اصل کتابوں کی تقلید تھیں۔ اس عرصے میں فلکیات، ریاضیات، فلسفہ، موسیقی اور کیمیا کی بہت سی عربی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں عربی و اسلامی علوم بیزنطہ، اُندلس اور اٹلی کے راستے مغرب میں منتقل ہوئے۔ یورپ کے ان شہروں میں ہی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا جو عربی و اسلامی علوم سے اخذ و اکتساب کے مراکز تھے۔ اس زمانے میں فلکیات پر البطروجی کی کتاب کا ترجمہ ایک ہمہ گیر تحریک کا نقطہ آغاز ثابت ہوتا ہے جس نے تحریکِ احیاء کے زمانے میں جدید علوم کے فروغ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ کوپر نیکس نے سیاروں کی گردش سے متعلق اپنے نظریات مسلمان ماہر فلکیات سے ہی اخذ کیے تھے۔ یورپ میں لوگوں کو مسلمانوں کے علوم کی اہمیت کا احساس ہوا تو انھوں نے مشرق کا رخ کیا۔ وہاں طویل عرصہ قیام کے دوران عربی زبان اور علوم کا مطالعہ کیا اور واپسی پر بہت سی کتابیں بھی ساتھ لے گئے۔

اس خطبے میں فواد سیز گین نے عالمی منظر نامے پر موجود حقائق اور عوامل کی مدد سے یورپ کی تحریک احیائے علوم پر اسلامی فکر کے اثرات کے ایسے ایسے چشم کشا انکشافات کیے ہیں کہ انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے واضح کیا ہے کہ قرونِ وسطی سے قرونِ جدیدہ تک آتے ہوئے عربی و اسلامی علوم نے احیائے علوم کی تحریک پر کیا اثرات ڈالے۔ اس تحریک کے حوالے سے یورپ کے بعض نام نہاد موٴرّخین کے باطل تصورات سے پردہ اٹھانے کا وقت آ گیا ہے اور عربوں اور مسلمانوں کے علوم پر مہارت رکھنے والے محققین کو ان حقائق کی وضاحت میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ انھوں

نے واضح کیا ہے کہ اگر ہم اپنے علمی ورثہ کی تحقیق کا فریضہ کماحقہ انجام دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ نتائج اور بھی حیران کن ہوں گے۔ اس خطبہ کا اہم زاویہ مسلمانوں کو اپنے ورثے کی بازیافت کے اہم کام کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

دسواں خطبہ بعنوان "عربی و اسلامی علوم میں اَسناد کی اہمیت" علم الحدیث کے بارے میں ایک جدید ذہن کی ایک ایسی مدلل تحقیق ہے جس سے حدیث کے سرمایے کے بارے میں گولڈ زیہر (I-Goldziher) اور اس قبیل کے دوسرے مستشرقین کے پھیلائے ہوئے منفی تاثرات کو زائل کرنے میں مدد مل رہی ہے۔ انھوں نے احادیث کی روایت اور تدوین کے سارے عمل کو اپنی اس مختصر تحریر میں واضح کر دیا ہے۔ اور یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ احادیث کو تحقیق و تدوین کے معروف طریقوں کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے اور یہ محض سمعی ذرائع کی بدولت ہم تک نہیں پہنچیں بلکہ ابتدائی دور میں احادیث کو تحریر کرنے کی مضبوط روایت موجود تھی۔ حدیث کی اسانید محض زبانی روایات پر مبنی نہیں تھیں بلکہ اپنے مؤلفین اور ثقہ راویوں کا حوالہ بھی دیتی ہیں۔ ان کے خیال میں تدوین حدیث کا کام اموی دور کے آخر میں مکمل ہو چکا تھا اور امام زہری (م ۱۲۵ھ) کا اس میں بہت بڑا حصہ ہے۔ احادیث کو ابواب کے اعتبار سے مرتب کرنے میں جن علماء نے ابتدائی کام کیا ان میں ابن جریج (م ۱۵۰ھ)، معمر بن راشد (م ۱۵۲ھ)، ہشام بن حسان (م ۱۴۸ھ)، سعید بن ابی عروبۃ (م ۱۵۰ھ) اور سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) کے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر فواد سیزگین نے اس خطبہ کے آخر میں بڑی اہم بات کر کے مسلمان محققین کو جھنجھوڑا ہے۔ ان کے بقول اب بھی احادیث کے اوّلین ماخذ و مصادر کو پایہ ثبوت تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے سب سے اوّلین شرط یہ رکھی ہے:

> "ہم سب سے پہلے تو ان فاسد آراء کے اثر سے آزاد ہوں جن کی رو سے اَسناد کا ظہور دوسری اور تیسری صدی ہجری میں ہوا اور راویوں کے نام دل سے گھڑ لیے گئے۔ علاوہ ازیں لازم ہے کہ قرونِ اولیٰ کی جو کتابیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ہم ان میں سے ملنے والے راویوں کے ناموں کی نہایت تفصیلی فہرستیں تیار کریں۔ پھر باعتبار اَسانید ان فہرستوں کا وسیع بنیادوں پر موازنہ بھی کیا جا سکتا ہے"۔[11]

گیارھواں خطبہ ابو الفرج الاصفہانی (زمانہ ۲۸۴ تا ۳۵۴ ہجری) کی تصنیف "کتاب الاغانی کے مآخذ" کے حوالے سے ہے۔ یہ کتاب اس عرب ورثے کی ایک اہم ترین دستاویز ہے جو موجودہ دنیا تک پہنچا ہے۔ یہ ضخیم کتاب اپنے تازہ ترین ایڈیشن کے مطابق بھی ۲۴ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں گائی جانے والی مشہور چیزیں اور ان کی مناسبت سے اشعار کا انتخاب، انوکھے واقعات، شعرا، ادبا اور گلوکاروں کے قصے شامل ہیں۔ مؤلّف کے اپنے بیان کے مطابق اس کی تالیف کا کام پچاس برسوں میں مکمل ہوا۔ اس کتاب کی اَسناد کی تلاش کا عمل بھی احادیث کی اَسناد کی تلاش کی طرز پر انجام دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فواد سیزگین نے اعلیٰ تحقیقی صلاحیتوں کے ذریعے کمال مہارت سے اس کے مآخذات کا سراغ لگایا ہے۔ انھوں نے اس حوالے سے یہ بھی بتایا ہے کہ بعض اہم ترین محققین جیسے فرانس کے بلاشیر (Blachere) امریکہ کے زولوندیک (Zolondek) اور مشرقی جرمنی کے فلایش ہمر (Fleischhammer) نے بھی اس کتاب کے مآخذ تلاش کرنے کا کام کیا۔ ان کے مطابق محدثین کے طریقے کو سمجھ کر ہم کتاب الاغانی کے مآخذات تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں انھوں نے اپنی کتاب میں ایسے تین سو مؤلفین کے اندراج کا ذکر کیا ہے جن کی کتابیں ناپید ہو چکی ہیں۔ دراصل یہی کتب کتاب الاغانی اور دیگر تصانیف کے اصل مآخذات ہیں۔ اس حوالے سے مزید تحقیق کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے ڈاکٹر فواد سیز گین لکھتے ہیں:

"میری خواہش ہے کہ میرے عرب رفقا میرے طریق کار سے اتفاق کرتے ہوئے اسی بنیاد پر اپنی توجہ بہت سی گم شدہ کتابوں کی طرف مبذول کریں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یونانی ورثے سے متعلق ہماری اکثر حالیہ معلومات ان لخت لخت تحریروں پر مبنی ہیں جنھیں محققین نے یکجا کر دیا ہے 12"

بارھواں خطبہ "قدیم عربی شاعری: حقیقت یا افسانہ" کے موضوع پر ہے۔ یہ خطبہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے بارے میں بذات خود ہمارے اپنے محققین بھی شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔ بالخصوص شہرہ آفاق مصری ادیب ڈاکٹر طہٰ حسین کا اس پہ اصرار بڑے معنی رکھتا ہے۔

قدیم عربی شاعری کے بارے میں شکوک و شبہات کے حوالے سے عام تصور یہ ہے ، جسے نلڈ کے (Theodor Neldeke) اور اہلوارد (Ahlwardt) جیسے مستشرقین بنیاد بناتے ہیں کہ اس عہد کی شاعری کی تدوین کا کام چھ نسلوں تک التوا میں پڑا رہا اور چھ نسلوں تک یہ سلسلہ زبانی روایت کے ذریعے آگے بڑھتا رہا۔ یورپی محققین نے اس تصوّر کی درستی کا آغاز کیا۔ لائل (Lyoll) پہلا محقق تھا جس نے عربی ادب پر گہری تحقیق کے ذریعے عربی شاعری کی تدوین کا یقین دلایا۔ اسی طرح کرنکو (Krenkow) نے بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عربوں نے بہت آغاز میں تدوین شعر کے فن سے واقفیت حاصل کر لی تھی ۔ مشہور مستشرق سپرنگر (A-Springer) نے انیسویں صدی کے نصف ثانی میں کئی تحقیقی مطالعوں کے ذریعے یہ رائے غلط ثابت کر دی کہ حدیثِ نبوی، تدوین کے بغیر صرف زبانی روایت کے ذریعے جاری رہی تھی۔ پھر میور (W.Muir) نے یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم عربی شاعری بہت قدیم دور میں بھی مدوّن کی جاتی تھی۔

ڈاکٹر فواد سیز گین نے عربی شاعری کی تدوین کو احادیث کی تدوین کے متوازی کام کے طور پر ثابت کرنے کے لیے کافی دلائل دیے ہیں۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ قدیم عربی شاعری محض سینہ بہ سینہ روایت کے ذریعے ہی اگلی نسلوں تک نہیں پہنچی بلکہ اسے باقاعدہ تدوین کے عمل سے محفوظ کرنے کا کام کیا گیا تھا۔ اس دور کی شاعری کے بارے میں چونکہ شکوک و شبہات کا اظہار کرنے والوں کے پیش نظر محض زبانی روایت کے ذریعے اسے آگے بڑھانے کا تصور تھا۔ بہت ساری تحقیق کے بعد اب جب کہ احادیث کی طرز پر فن شعر کی تدوین کاری کے بھی کافی شواہد مل چکے ہیں تو اب ان شکوک و شبہات کی گنجائش بھی ختم ہو گئی ہے۔ بقول ڈاکٹر فواد سیز گین:

"نلڈ کے اور اہلوارد نے قدیم شاعری کے بارے میں اپنے شکوک کی بنیاد ہی اس امر پر قائم کی تھی کہ ان کے نزدیک حماد الرّاویۃ اور خلف الاحمر پر جعلی شعر گھڑنے کا الزام عائد ہوتا تھا۔ سچی بات یہ ہے

کہ ان پر اس طرح کا حکم لگانا نا انصافی ہے، کیوں کہ اس میدان میں آخر یہی دو آدمی تو نہیں تھے۔
قدیم شاعری کی پرکھ رکھنے والے اور بھی بہت لوگ تھے"۔[13]

اس سلسلے کا آخری **تیرھواں خطبہ** بہت اہم ہے، جس میں "اسلامی ثقافت میں جمود کے اسباب" پر بحث کی گئی ہے۔ یہ امت مسلمہ کا ایک اجتماعی مسئلہ ہے اور جس پر ڈاکٹر فواد سیز گین جیسے دانش وروں کا قلم اٹھانا خوش قسمتی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس خطبے میں فاضل مصنف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ محض ماضی کے سرمایے کو جمع کرکے اس پر فخر کرنے یا زیادہ سے زیادہ تقلیدی سطح پر ان نظریات کو قبول کرنے سے ہم اس ثقافتی جمود کو نہیں توڑ سکتے اور نہ ہی ہم یورپ کی اندھی تقلید کرکے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ ترکی کے اہلِ نظر کو ایک صدی کے علمی و فکری سفر کے بعد جزوی طور پر ہو گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ سب سے پہلے ہمیں اس فکری جمود کے اصل اسباب پر توجہ دینا ہو گی۔ جب ہم ان اسباب کا تعین کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر اس جمود کو توڑنے میں بھی یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔

فکری حوالے سے تجدد اور تازہ کاری کے لیے انھوں نے جو راستہ تجویز کیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی قوم اور پھر دوسری اقوام کے علمی و فکری سرمائے پر گہری تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ اس عمل کے بغیر ہم نئی علمی فتوحات کے ہرگز اہل نہیں بن سکتے۔ مسیحی دنیا نے ترجیحاتِ علمی کا جو گہرا شعور اپنے اندر پیدا کیا، اس نے نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کی۔ ہمیں بھی اپنے آپ کو ایسی ہی ترجیحات کے لیے وقف کرنا ہو گا اور یہ ارادہ کرنا ہو گا کہ ہم نے سائنس اور دیگر علوم کے میدان میں ان سے آگے بڑھنا ہے اور ان کے پیش کردہ نتائج کو تشکیک اور تنقیدی عمل سے گزارنا ہے کیوں کہ علم کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس میں غور و فکر اور تجسّس کی تحقیقی سرگرمیوں کے نئے دروازے کھول سکتے ہیں۔

اس علمی جمود کا ایک اہم زاویہ روشن کرتے ہوئے ڈاکٹر فواد سیز گین نے بتایا ہے کہ عثمانیوں نے اگرچہ اپنے اسلاف سے ملنے والے علمی ورثے سے غفلت نہیں برتی لیکن وہ اس حقیقت کا مکمل ادراک نہ کر سکے کہ ان تک پہنچنے والے علوم ایک صدی قبل جمود اور زوال کے مرحلے میں داخل ہو چکے تھے۔ اس کے برعکس مسیحی دنیا میں ترجیحاتِ علمی کا شعور پروان چڑھ چکا تھا اور ان اقوام میں یہ جذبہ بیدار ہو گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

اسلامی تہذیب کے وابستگان جو مستقبل میں اپنا کھویا ہوا علمی مقام حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں انھیں چاہیے کہ پہلے اس جمود کا ٹھیک ٹھیک سراغ لگانے کے لیے عملی مساعی کا آغاز کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی دنیا ایسے افراد اور اذہان کے حصول کے لیے اپنے جملہ نصابات اور علمی ترجیحات کا از سر نو تعین کرے۔ کیوں کہ اس عمل کے بغیر بلند تر مقاصد حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

ان خطبات کو آپ پہلے صفحہ سے آخری صفحہ تک پڑھ جائیں، اس مطالعے کے دوران آپ کو کہیں یہ احساس نہیں ہو گا کہ یہ مواد کسی بدیسی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ نہ ہی اس میں اصطلاحات کا ایسا انبار آپ کو نظر آئے گا جو دور از کار اور دقیق ہو۔ ڈاکٹر خورشید رضوی ترجمہ نگاری کے جملہ فنی لوازمات اور بنیادی اصولوں کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ مختلف زبانوں پر کامل دسترس رکھنے کی وجہ سے ان کے تراجم بامحاورہ، رواں اور سلیس ہیں جو کہ بلند پایا علمی معیارات کے حامل ہیں۔ ترجمہ نگاری کے

حوالے سے ان کا اسلوب اور ابلاغ انتہائی شاندار اور منفرد ہے۔ اس ترجمے کو ہم ڈاکٹر خورشید رضوی کی عربی دانی اور اُردو فہمی کا شاہکار قرار دے سکتے ہیں۔ اس عظیم کام کے بارے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> "محمد حسن عسکری نے ترجمے کے فن پر بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ترجمے کا ایک بڑا مقصد زبان کے اسالیب کی توسیع بھی ہے" اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر رضوی نے اس ترجمے کے ذریعے اُردو نثر کے رقبے کو بھی وسیع کیا ہے اور عربی اسلوب کی چھاپ کہیں کہیں قائم رکھی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ انھوں نے بعض ایسے لفظوں کو علیٰ حالیہ قائم رکھا ہے جیسے وہ اصل عربی متن پر تھے"۔[14]

خلاصہ بحث

ڈاکٹر فواد سیزگین کے ان علمی کارناموں کا ایک اجمالی سا جائزہ بھی ہمیں اس نتیجہ پر پہنچا دیتا ہے کہ اسے مختلف علوم کے منظر و پیش منظر پر کس قدر عبور حاصل ہے اور وہ مختلف نظریات اور تصوّرات کے تجزیے کے بعد کس مہارت سے اصل حقائق اور سچائی تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک ایسے محقق کا اسلامی علوم پر مکمل عبور اہل علم کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ ان خطبات کا ترجمہ بھی کسی معجزے سے کم نہیں اور اس کام کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ اس اہم علمی کام کے لیے ڈاکٹر خورشید رضوی جیسا نابغہ ہی درکار تھا۔ کیوں کہ ان سب نظریات اور تصوّرات کا غیر جذباتی اور مدلل انداز میں تجزیہ کرنے کے لیے کسی ایسے ہی بڑے عالم کی ضرورت تھی۔ مختلف آرا اور نظریات کے تجزیے سے درست سمت میں قدم بڑھانے اور رہنمائی کا ہنر دیکھنا ہو تو اس کے لیے ڈاکٹر خورشید رضوی کی شہرۂ آفاق تالیف "عربی ادب قبل از اسلام" جلد اول و دوم ایک بہترین مثال ہے۔ ان خطبات کے مطالعہ سے قارئین کو عالمی اور آفاقی فکریات پر تہذیبِ اسلامی کے گہرے اثرات اور تہذیبِ اسلامی کے فیضان سے متعارف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اور اہلِ فکر و دانش کے لیے ان علمی دستاویزات اور تہذیبی ورثے کی طرف مراجعت کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جن کا ذکر فاضل مؤلّف نے اپنے خطبات میں کیا ہے۔ یہ خطبات جس تفصیلی کام کا خلاصہ ہیں۔ ذرا تصوّر کیجیے کہ وہ علمی و فکری منصوبہ کتنا عالیشان ہو گا۔

اگرچہ علوم کے عالمی منظر نامے پر مسلمانوں اور عربوں کی علمی خدمات کا اعتراف اہلِ مغرب کے بڑے بڑے علما کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ مگر یہ اعتراف نیم دلانہ اور نامکمل تھا۔ اس اعتراف کو پورے علمی وقار کے ساتھ اہلِ دانش کے ہاں پیش کرنے میں ڈاکٹر فواد سیزگین کے تحقیقی کام کا کلیدی کردار ہے۔ ان خطبات اور تحقیقی کام کے بعد یہ تصوّر کی رد ہوا کہ علم کو بطور علم، فروغ سر زمین یونان میں ہوا یا پھر بارھویں صدی عیسوی میں اہلِ مغرب کے توسط سے ہوا کیوں کہ اس وقت تک ابھی یورپ دورِ ظلمت سے بیدار نہیں ہوا تھا۔ مسلمانوں اور دیگر اقوام کی کوششوں کے باوجود علم کی حقیقی روح صحیح معنوں میں ان کے اندر پوری طرح بیدار نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر فواد سیزگین نے تقریباً تین دہائیوں کی محنت شاقہ کے بعد "تاریخ التراث العربی" کی دس سے زائد ضخیم جلدیں مرتّب کیں۔ یہ مجلدات دنیا کے کم و بیش تمام علوم کا احاطہ کر رہی ہیں جن میں علم الفلک، نفسیات، احکام النجوم، اخلاق، آثار العلویہ، فلسفہ، منطق، سیاست، نحو، بلاغت، علم الاجتماع، جغرافیہ، طبیعیات، جیالوجی اور موسیقی کے علوم شامل ہیں۔ ان خطبات کے ذریعے مختلف علوم و فنون کے تاریخی ارتقا میں

نہ صرف مسلم تہذیب کے حقیقی کارہائے نمایاں اجاگر ہوتے ہیں بلکہ بہت سی غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ ان خطبات میں ڈاکٹر فواد سیزگین نے دنیائے علوم وفنون کے عمومی رویے کے خلاف یہ صدائے احتجاج بلند کی ہے کہ سائنسی علوم کی تاریخ میں پہلے قدیم یونانی ادوار اور اس کے فورا بعد یورپ کی تحریک احیائے علوم کے زمانے کو جگہ دی جائے۔ اس کے برعکس تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ اہل یونان سے پہلے بھی اڑھائی ہزار برس کی علمی تاریخ موجود تھی ۔ پھر یونانی دور اور احیائے علوم کے دور کے درمیانی عرصے میں عربوں کی گراں قدر سائنسی و علمی خدمات کا زمانہ آتا ہے جس کے بغیر تاریخ علوم کا تسلسل قائم نہیں ہوتا۔

References

1 Dr. Khurshid Rizvi, trans; Tareekh-e-'Uloom mein Tehzeeb-e-Islamī kā Muqām (Islamabad: International Islamic University, 2005), 11.
2 Rizvi, Tareekh-e-'Uloom mein Tehzeeb-e-Islamī kā Muqām, 13.
3 Dr. Khurshid Rizvi, Tareekh-e-'Uloom mein Tehzeeb-e-Islamī kā Muqām, 14.
4 Shams-Ur-Rehman Farooqi. Daryaaft Aur Bazyaaft, Mashmoola, Fun-e-Tarjama Karee, Murattaba, Safdar Rasheed (Islamabad: Porab Academy, 2015 AD), 36.
5 Jilani Kamran, Tanqeed kā Naya Pasmanzar (Lahore: Maktaba Adab-e-Jadeed, 1964), 67.
6 Dr. Tehseen Faraqi, (Mazmoon Mashmoola) Armaghan-e-Khurshid (Lahore: Punjab University, 2015), 258.
7 Rizvi, Tareekh-e-'Uloom mein Tehzeeb-e-Islamī kā Muqām, 80.
8 Rizvi, Tareekh-e-'Uloom mein Tehzeeb-e-Islamī kā Muqām, 87.
9 Rizvi, Tareekh-e-'Uloom mein Tehzeeb-e-Islamī kā Muqām, 96.
10 Rizvi, Tareekh-e-'Uloom mein Tehzeeb-e-Islamī kā Muqām, 122.
11 Rizvi, Tareekh-e-'Uloom mein Tehzeeb-e-Islamī kā Muqām, 172-73.
12 Rizvi, Tareekh-e-'Uloom mein Tehzeeb-e-Islamī kā Muqām, 186.
13 Rizvi, Tareekh-e-'Uloom mein Tehzeeb-e-Islamī kā Muqām, 194.
14 Faraqi, Tanqeed kā Naya Pasmanzar, 262.